اورنگزیب یوسفزئی فروری2017

فہمِ قرآن کا جدید ترین منہاج

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

یہ منہاج جو جدید ترین صرف اس لیے کہلا سکے گا کہ اسلامی تاریخ کے چودہ سو سالہ ماضی میں کسی مسلم دانشور نے تمام تر ممکنہ جہتوں اور تقابلی پہلووں کے حوالے سے اس کی جانب توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ عمومی اسلوب یہ رہا کہ ہر قابلِ ذکر دانشور کی تحریروں نے کسی ایک مخصوص پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کیے رکھی اور اُسی پہلو سے متعلقہ نکات کی اصلاح کو فہم میں کاملیت کے شافی و کافی نسخے کے طور پر پیش کیا۔ اندریں حالات یہ منہاج اپنی اصل میں جدید نہ ہوتے ہوئے بھی سابقہ طویل عرصے کے دوران قرآن کی دفتین میں موجود، محفوظ و مستور رہا۔ اور اسے سرسری نظر سے دیکھ کر صرفِ نظر سے کام لیا جاتا رہا، یعنی نظر انداز کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ قرآن میں دی گئی صریح توضاحیت کے علی الرغم وہ حدود فراموشی بدرجہ اتم جاری رہی جو اس منہاج کی رُو سے قطعی ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ قرآن کی زبان میں وہ ذاتِ پاک جو اس کائنات کے انتہائے شعور کے درجے کا مالک ہے، اس جانب بار بار توجہ دلاتا رہا۔ لیکن مستبد قوتوں کی کارفرمائیوں نے مسلم دانشوروں اور عوام کو ایک فریب کی دنیا میں لا بسایا۔ ذیل کی سطور میں آپ دیکھیں گے کہ وہ حقیقی منہاج کس طرح پسِ پشت ڈال کر دانشورانِ ملت غیر قرآنی معیارات کو لے کر اپنی دانش و علم کو غیر قرآنی کسوٹی پر بے نتیجہ صرف کرتے رہے۔ اور اس کے نتیجے میں کوئی بھی منہاج قرآن فہمی کو اُس مطلوبہ سطح تک نہ لے جا سکا جہاں کاملیت کا معیار حاصل کرتے ہوئے ایک مجموعی قبولیت کی صورتِ حال پیدا کی جا سکتی۔

کیا امت مسلمہ کا یہ ایک بڑا المیہ نہیں ہے کہ چودہ سو سال سے زیادہ کی مدت گذر جانے، اور تراجم و تفاسیر کا ایک ہمالیہ سے بھی بلند پہاڑ ورثے میں مل جانے کے باوجود بھی قرآن کی نت نئی تفاسیر اور تراجم کی تیاری کا سلسلہ انفرادی سطح پر جاری ہے، جو اس عمومی رجحان کا غماض ہے کہ جمہورِ امت کا آج تک قرآنِ فہمی کی کسی بھی کوشش پر اجماع نہیں ہو سکا۔ اور تشنہ کامی انہیں تفہیم کی کوششوں کو جاری رکھنے پر مہمیز کیے رکھتی ہے۔ دوسری جانب یہ بھی ایک اور بڑا المیہ ہے کہ مسلم حکومتوں نے آج تک اس سلسلے میں کسی بھی منظم اور اعلیٰ سطح کی با اختیار اور اجتماعی کوشش سے صرف نظر کیے رکھا ہے۔ تمام وسائل کے میسر ہونے کے باوجود یہ سنگین غفلت اپنے تیئں ایک مہیب شیطانی اشتراکِ کار کی جانب واضح اشارہ کرتی ہے۔

اسلامی تہذیب میں علم الکلام اور اس کے ماخذات

عہدِ جدید کے چند منتخب مسلم دانشوروں نے فہمِ قرآن کے جدید منہاج کے عنوان کے تحت ہماری تاریخ کے اولین دور کا انتہائی پُر مغز اور دقیق تجزیہ کیا ہے۔ ان کی قابلِ قدر کاوشوں کا ماحصل ان کے حکمت و دانش سے بھرپور تحقیقی مواد میں جو دیگر قابلِ قدر تحریروں کے ساتھ ساتھ جناب الطاف جاوید کی پُر مغز کتاب میں کچھ اس طرح پیش کر دیا گیا ہے کہ اس فہم کے تجریدی ارتقاء کی صورتِ حال ہمارے سامنے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ ذیل کے صفحات میں ہم اس مخزونہِ علم سے پورا استفادہ کرتے ہوئے اس پر جدید ترین تاریخی اور لسانی تحقیق کی روشنی میں جابجا قدرے تنقیدی نظر بھی ڈالیں گے تاکہ اس قیمتی مواد کو نہ صرف از سرِ نو قرآنی طالب علموں کی توجہ کا مرکز بنایا جائے، کیونکہ اس کے بغیر ان کا علمی تناظر یا پسِ منظر ادھورا رہ جانے کا اندیشہ ہے، بلکہ جدید علمی انکشافات کی روشنی میں فہمِ قرآن کا ایک اور جدید ترین منہاج بھی، جو قرآن ہی کی نصوص میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے لیکن انسان کے ذہنی ارتقاء کے نتیجے میں آج سامنے آیا ہے، دنیا کے سامنے آشکار کر دیا جائے۔

فہمِ قرآن میں یونانی عقلیت اور منطقِ استخراجی

ہمارے ان قابلِ قدر دانشوروں کے مطابق قرآنِ کریم کے عہدِ نزول میں یونانی عقلیت اور منطق استخراجی وہ ذہنی آلات تھے جن سے فکر و دانش کام لے کر پیش آمدہ مسائل کو حل کرتی اور نئے حقائق معلوم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ گویا یہ ایک بڑی تاریخی غلطی کی ابتدا تھی۔

لیکن یہاں ہمارے محترم دانشور یہ حقیقت نظر انداز کر گئے کہ عہدِ نزول میں تو خود رسالتمآب کی ذاتِ اقدس موجود تھی اور قرآنی فہم اور اس کے ابلاغ کے ضمن میں آپ کی زندگی میں کسی التباس و اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ سکتی تھی۔ آپ کا فہمِ قرآن ارشاداتِ ربانی کی حقیقی روح اور نچوڑ پر مبنی تھا کیونکہ آپ کے علم و ادراک کو خالق نے بذاتِ خود جلا بخشی، مہمیز کیا اور افقِ اعلیٰ کے درجے تک پہنچایا تھا۔ درحقیقت قرآن کے وہ حقائق جو خود آپ کے ذریعے آپ کے قریبی حلقے کے اکابرین [صحابہِ کرام] کے حیطہِ ادراک میں آ چکے تھے وہ کسی کمی بیشی کے بغیر خالص عقلیت پر مبنی وہی حقائق تھے جو باری تعالیٰ انسانیت کے دامن میں پہنچانا چاہتے تھے۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ آنحضرت کی وفاتِ حسرت آیات کے صرف ۲۴ برس بعد ہی حکومتِ الٰہیہ کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور اس کی ضد میں مسلم اور غیر مسلم عوام پر ایک کاٹ کھانے والی عرب ڈکٹیٹر شپ مسلط کر دی گئی۔ اور اسلام کا سفینہ اسلام کے اولین بُت پرست دشمنوں کے قبضے میں آ گیا۔ پھر انہوں نے اس کے ساتھ جو کھلواڑ کی وہ تاریخ کے صفحات میں آگ اور خون سے لکھی گئی ہے۔

تو ہماری زیرِ نظر کتاب میں مندرج یونانی عقلیت اور استخراجی منطق کا دور دراصل قرآن کا عہدِ نزول نہیں کہا جا سکتا۔ یہ دور تو فی الحقیقت دورِ عثمانی کے گذر جانے کے بعد، یعنی ملوکیت کے خلافتِ راشدہ کو غصب کرنے کے زمانے سے اپنی ابتدا کرتا ہے۔ یہ وہی وقت تھا جب ناجائز اور غیر قانونی غاصبوں نے اپنے مکارانہ غلبے کے جواز کے لیے دین کی حقیقی شکل کو بگاڑنا اپنا فرضِ اولین سمجھا۔ ان غاصبوں نے اس مقصد کو موثر طور پر بار آور کرنے کے لیے قرآن کا گہرا علم رکھنے والے ہر انسان کو موت کے گھاٹ اُتارنا ضروری جانا اور اس کے لیے جلد ہی وحشی شامی فوجوں کا ایک لشکرِ جرار بھیجا گیا جس نے

خلافتِ راشدہ کے دارالخلافہ کو قتلِ عام کا نشانہ بنایا۔ خلافت کے تمام آفسز اور اس کا شاندار ریکارڈ مکمل طور پر تلف کر دیا گیا۔ معدودے چند بقیۃ السیف کو موت کا خوف دے کر ساتھ ملا لیا گیا۔ چند ایک کو جلاوطن اور گمنام کر دیا گیا۔ اور ایک ہنستا بستا ترقی یافتہ دارالحکومت ایک اُجڑ ادیار اور کلبۂ احزاں میں تبدیل کر کے گمنامی کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔ پھر قرآن کے معنی یکسر بدل دینے کے لیے اسی یونانی استخراجی منطق اور علم الکلام کا سرکاری طور پر استعمال شروع کروا دیا گیا جس کی جانب کتابِ مذکور میں ہمارے نہایت قابلِ قدر دانشوروں نے اشارہ دیا ہے۔ پھر دیکھیے اُس منطق کے استعمال کے نتائج کے ضمن میں بعد ازاں کیا صورتِ حال در پیش آئی، جیسا کہ ہمارے محترم دانشورانِ قرآن تحریر فرماتے ہیں۔

مگر اس عقلیت کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس کی اساس تجربہ و مشاہدہ پر نہ تھی۔ اس میں آزاد اور غیر جانبدار ذہن سے فطرت کے اعمال پر غور و خوض تو کیا جاتا تھا مگر مفروضوں (Hypotheses) سے نتائج کا استنباط کرتے وقت ان کو تجربہ و مشاہدہ کے عمل سے معروضی مادی حقیقت کی کسوٹی پر جانچا نہیں جاتا تھا۔ اس غلطی کی اساس منطق استخراجی تھی۔ جس میں صغریٰ و کبریٰ کے قضایا سے نتیجہ تو اخذ کر لیا جاتا ہے مگر قضیہ کبریٰ (Universal Proposition) کی معروضی مادی حقیقت سے مطابقت کو نہیں جانچا جاتا تھا۔۔۔ مثلاً

قضیہ کبریٰ = سارے دستر خوان پھول ہوتے ہیں۔ قضیہ صغریٰ = کپڑے کا یہ ٹکڑا چونکہ دستر خوان ہے۔ نتیجہ = لہٰذا یہ بھی پھول ہے۔

اس مثال میں نتیجہ اپنے دونوں قضایا کا فطری جواب ہے۔ یعنی نتیجہ فکر کے داخلی قوانین کے عین مطابق ہے۔ مگر یہ بات کہ دستر خوان پھول ہوتے ہیں یا نہیں،، معروضی مادی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے، اور یقینی بات ہے کہ دستر خوان پھول نہیں ہوتے۔ لہٰذا قضیہ کبریٰ کے معروضی مادی حقیقت سے مطابقت نہ رکھنے کی وجہ سے جواب غلط ہے۔

اگرچہ امام ابنِ تیمیہ اور شیخ الاشراق وغیرہ نے منطق کے اس رویہ پر تنقید کی ہے، مگر عام طور پر یہی منطق ذہنی آلہ کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ اسی کی وجہ سے مسلم علم الکلام (Scholasticism) میں مابعد الطبیعاتی اور تجریدی مسائل پر طویل اور لا طائل بحثیں موجود ہیں۔ جن میں صرف منطقِ قیاسی (استخراجی) سے کام لیا گیا ہے۔ اور عملی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

فہمِ قرآن میں منطقِ استقرائی کا استعمال

لیکن علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں فرمایا ہے کہ منطق استقرائی، جس پر سائنس کی عمارت استوار ہوئی ہے، مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ بلکہ قرآنِ حکیم نے اپنے استدلال میں اسی منطقی اسلوب سے کام لیا ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر صحیح ہو گی، مگر مسلمان اس منطق سے کام نہیں لے سکے اور نہ ہی اسے فکر کا آلہ بنا سکے۔ دراصل انہیں جبراً اس انداز کو اختیار کرنے سے روک دیا گیا۔ لہٰذا تمام متکلمین کے ذہن پر منطق استخراجی ہی چھائی رہی۔ اسی لیے اقبال نے کہا ہے کہ "چوں سرمہِ رازی را از دیدہ فروشتم۔۔۔۔۔۔ تقدیرِ امم دیدم پنہاں بہ کتابِ اندر" ۔ یہ سرمہ رازی ہی یونانی عقلیت اور

منطق استخراجی تھی، جس کا نہ معروضی مادی حقیقت سے اور نہ ہی معاشرتی زندگی کے احوال سے کوئی تعلق تھا۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد ارسطو کے مقولاتِ عشرہ اور منطقِ استخراجی پر تنقید شروع ہوئی۔ فکر کے داخلی قوانین کے ساتھ قضیہ کبریٰ کا معروضی مادی حقیقت کے ساتھ تطابق کرنا بھی لازمی قرار پایا۔ یعنی قضیہ کبریٰ سے،،، اس کو معروضی مادی حقیقت کے مطابق جانچے بغیر،،، نتائج اخذ کرنے کو غلط ٹھہرایا گیا۔ اس تبدیلی سے سارا منطقی عمل بدل گیا۔ منطقِ استخراجی میں حقیقتِ کلّی سے جزئی نتیجہ تک پہنچا جاتا تھا،،، تو اب جزئی حقائق کے مطالعہ سے کلّی حقیقت تک پہنچنے کا عمل شروع ہو گیا۔

پہلی مثال پر غور کریں تو استقراء کی رُو سے ہر ملک میں استعمال ہونے والے دستر خوانوں کا عملاً مشاہدہ کیا جائے گا کہ کسی ملک میں دستر خوان پھول تو نہیں ہوتے۔۔۔ جب معلوم ہو جائے کہ ہر ملک میں دستر خوان کپڑے کے اس ٹکڑے کو کہا جاتا ہے جو کھاتے وقت کام میں لایا جاتا ہے، تو یہ کلیہ بنالیا جائے گا کہ دستر خوان پھول نہیں ہوتے بلکہ کپڑے کا وہ ٹکڑا ہوتے ہیں جو کھانے کے مقاصد کے لیے کام میں لایا جاتا ہے"۔ اس کُلیہ یا تعمیم کی اساس تجربہ و مشاہدہ پر ہے اور ہر ملک کے جزئی مطالعہ سے اس کلّی حقیقت تک پہنچا گیا ہے۔ اب فکر اپنے داخلی قوانین کے مطابق لاکھ نتائج نکالے کہ "دستر خوان پھول ہوتے ہیں"،،، چونکہ تجربہ و مشاہدہ نے اپنے جزئی مطالعہ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس قسم کی کوئی چیز کسی ملک میں نہیں پائی جاتی، لہٰذا فکر اپنے نتیجے میں غلط ہے۔

امام غزالی اور کانٹ[Kant]

منطقِ استقرائی کے جزء کے مطالعہ سے کُل کی طرف جانے کے عمل نے مذہب کے مابعد الطبیعاتی عقائد کو تحقیق و مطالعہ کی دنیا سے باہر نکال دیا۔ یہاں تک کہ کانٹ (Kant) نے اعلان کر دیا کہ عقلِ انسانی مابعد الطبیعاتی حقائق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ لہٰذا خدا، ملائکہ، عرش و کرسی، جنت و جہنم، حیات بعد الموت، اعمال کے بعدُ الموت زندگی پر اثرات کی نوعیت کو عقلی طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان تک رسائی کے لیے کانٹ نے اپنے پیشرُو امام غزالی کی طرح اخلاقی تزکیہ کو ذریعہ قرار دیا۔

امام غزالی نے کانٹ(Kant) سے پہلے اسلامی علم الکلام میں یہی رویہ اختیار کیا تھا۔ ان کی فلسفہ یونان کے خلاف محاذ آرائی کی نوعیت ویسی ہی تھی جیسی کانٹ کی مسیحی متکلمین کی مخالفت میں اختیار کی گئی تھی۔ غزالی سے قبل و بعد مسلم معاشرہ تو بڑی سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہوتا چلا گیا۔ اس لیے یونانی عقلیت کے متبادل کوئی دوسرا ذہنی آلہ دریافت نہ کیا جا سکا۔ مگر کانٹ کا عہد تو فطرت کے تمام پہلوؤں میں تلاش و تحقیق کا چڑھتا ہوا طوفان تھا۔ کانٹ کے انتقاد نے سائنسی منہاجِ تحقیق کے راستے سے مسیحی متکلمین کی قیل و قال کو صاف کر دیا۔

اب کہ منطقِ استقرائی نے فاتح کی حیثیت سے مذہب کے مابعد الطبیعاتی عقائد کو موضوع مطالعہ بنانے سے انکار کر دیا۔۔۔اور یقیناً یہ عقائد سائنسی عقلیت کے زیرِ مطالعہ آ بھی نہیں سکتے تھے۔۔۔ لہٰذا مذہب زندگی کے کاروبار سے عملاً خارج ہو گیا۔ تحقیق و مطالعہ کا موضوع مادہ اور اس کے مظاہرات رہ گئے۔ چنانچہ ایک صدی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ علوم کی مختلف اصناف اور ایجادات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ جس سے انسانی زندگی کے متعلق نہ صرف نقطۂِ نظر اور سیاسی رویہ بدلا بلکہ زندگی کا پورا نقشہ (Pattern) ہی بدل گیا۔

اس صورتِ حال سے نہ صرف اسلامی علم الکلام کی افادیت ہی ختم ہو گئی بلکہ عیسائی اور دوسرے مذاہب کا اپنے مابعد الطبیعاتی عقائد کے حق میں تخلیق کردہ عقلی استدلال کا ذخیرہ بھی بے کار ثابت ہوا۔

جدلیاتی منطق کا دور اور وحدت الادیان

یہ بات یہیں ختم نہ ہوئی کہ قضیہ کبریٰ کا معروضی مادی حقیقت سے مطابقت رکھنا ضروری ہے،،،، بلکہ بات آگے بڑھی، اور انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں پیروانِ ہیگل (Hegel) کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے فلسفیوں اور دانشوروں (Hegelian Left) کے سرخیل کارل مارکس نے فطرت (Nature) کے ساتھ معاشرہ کی معاشی ہیئتِ ترکیبی کو بھی موضوع مطالعہ بنا دیا۔ اور اس طرح سائنسی عقلیت کی جگہ جدلیاتی عقلیت (Dialectical Rationalism) نے لے لی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ فطرت، معاشرہ اور ذہنِ انسانی اپنی حرکت میں ہموار Smooth نہیں بلکہ جدلیاتی ہیں، اور یہ حرکت دولابی Cyclic نہیں بلکہ پہلے دائرہ سے دوسرے وسیع تر دائرہ میں قدم رکھتی ہے، یعنی اس کا کیریکٹر ترقی پسند Spiral ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرتی معاملات و مسائل کے حل میں جب تک معاشرہ کی معاشی ہیئتِ ترکیبی کے مطالعہ کو شامل نہیں کیا جائے گا، نتائج صحیح بر آمد نہیں ہوں گے۔ اس منہاجِ مطالعہ کو معاشرتی یا سماجی حرکیات کی سائنس (Science of Social Dynamics) کا نام دیا گیا۔ اس نئی معاشرتی سائنس کی اساس جدلیاتی منطق پر تھی۔ اس منطق نے استقرائی منطق کی خامیوں کو اسی طرح دُور کیا، جس طرح استقرائی منطق نے استخراجی منطق کی کمزوریوں کو دُور کیا تھا۔

استقرائی منطق وجود کے مظاہر، اصنافِ علوم اور معاشرتی واقعات کے تنوع اور بوقلمونی کے درمیان کسی عالمگیر ربط و لزوم (Universal Connection) کو معلوم نہیں کر سکی تھی۔ یعنی ایک مظہر کا دوسرے مظہر سے، ایک صنفِ علم کا دوسری صنفِ علم سے، ایک نوع Species کا دوسری نوع سے،،،، اور ایک معاشرے کا دوسرے معاشرے سے، اور تاریخ کے ایک عہد کا دوسرے عہد کے درمیان نامیاتی ربط و لزوم کی موجودگی کا احساس جدلیاتی منطق نے دلایا، اور اس طرح وجود، فطرت اور معاشرتی زندگی کے باہمی اختلافات کو ایک وحدت میں سمونے

کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس نئی معاشرتی سائنس اور جدلیاتی منطق کے اس قانون نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی کہ تمام مذاہب ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان ایک ربط و لزوم پایا جاتا ہے۔ یہ ایک ہی شجر کی مختلف شاخیں ہیں۔ اس طرح وحدتِ ادیان کا ایک نیا موضوع سامنے آ گیا۔ جس پر مذاہب کی پیشوائیت نے کوئی تحقیقی کام نہیں ہونے دیا تھا، کیونکہ یہ موضوع اور اس پر تحقیق کے نتائج اس کے مفاد کے خلاف جاتے تھے۔ دوسری کتبِ الٰہیہ کے مقابل قرآنِ حکیم نے وحدتِ ادیان کے موضوع پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور اس پہلو سے بھی وحدتِ انسانیت کو قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس کتابِ مقدس کو اساس بنا کر وحدتِ الادیان کی نئی سائنس کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ جس کی ابتداء مولانا ابوالکلام آزاد نے کر دی ہے۔

طبقاتی پیراڈائم [Paradigm]

اس صورتِ حال سے مذہب کے مابعد الطبیعاتی عقائد کے لیے اپنے ثبوت میں نہ صرف معروضی مادی حقیقت سے مطابقت رکھنا ضروری قرار پایا بلکہ ان کی معاشرتی قیمت بھی معلوم کرنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ یعنی یہ عقائد معاشرہ کی ہیئتِ ترکیبی میں ذرائع پیداوار پر قابض طبقہ کے مفاد کی حمایت کرتے ہیں یا محروم محنت کش عوام کے مفاد کی۔ لہٰذا اس عہد میں تمام مذاہب کے علم الکلام کو نہ صرف فطرت کے معلوم شدہ قوانین کی نہج پر جانچا جاتا ہے بلکہ یہ بھی کہ یہ دونوں معاشی طبقات میں سے کس طبقے کے مفاد کی حمایت کرتا ہے۔ کرہ ارض کے جن ممالک میں محنت کش اور محروم طبقات کی انقلابی تحریک اپنے آقاؤں سے پنجہ آزمائی کر رہی ہے، وہاں مذہب کے لیے یہ مشکل مرحلہ بھی درپیش ہو چکا ہے کہ وہ اس ضمن میں اپنی پوزیشن صاف کرے اور بتائے کہ اس کے عقائد کس طبقہ کے مفاد کی حمایت کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر موجودہ دور میں وجودِ باری تعالیٰ کے حق میں صرف یہ کہ کر دامن نہیں چھڑایا جا سکتا کہ حیات اور شعور سے عاری اندھے اور تاریک مادہ میں یہ خلقی قابلیت Intrinsic Ability کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ حیات Life اور شعور Consciousness جیسی اعلیٰ اقدار کی تخلیق کا باعث بن جائے! بلکہ اسے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ خدا کا تصور ذرائع پیداوار کے مالک یا محنت کش محروم طبقے کے مفادات میں سے کس کے حق میں جاتا ہے۔ اور خدا کو ماننے والوں کا تاریخِ انسانی میں کیا کردار رہا ہے؟

اب مذہب کے لیے مشکل در مشکل والی بات ہو چکی ہے۔ کیونکہ ابھی مذہب بے چارا اپنے مابعد الطبیعاتی توہمات، دیوتاؤں اور شیطانوں کی دیومالا کے قصوں کی وجہ سے نیچرل سائنس کے حملوں سے پوری طرح اپنا بچاؤ کرنے بھی نہ پایا تھا کہ سماجی حرکیات کی سائنس نے حملہ کر دیا۔ یہ بات تو عیاں ہے کہ ساری انسانی تاریخ مذہبی پیشواؤں کی لوٹ کھسوٹ، قتل و زنا، اور ظلم و بربریت سے اٹی پڑی ہے۔ تاریخ کے ہر دور اور ہر ملک میں اس مذہبی قیادت نے مالدار اور حکمران طبقوں سے رشتہ جوڑ کر مذہب کی ایسی تعبیر کر دی کہ وہ مراعات یافتہ اور بالادست طبقات کے مفاد کو پورا کرنے میں مدد دینے لگا۔ اور پسماندہ اور کمزور عوام کے زیادہ سے زیادہ استحصال کا ذریعہ بن گیا۔

دورِ ملوکیت کے اثرات

اسلام کا دامن اس ضمن میں اتنا گھناؤنا نہیں جتنا دوسرے مذاہب کا ہے۔ مگر ہوا یہاں بھی وہی کچھ جو دوسرے مذاہب کے ساتھ ہوا۔ اگرچہ کم پیمانہ پر ہوا۔ خلافتِ دمشق کے عہد سے ہماری مذہبی قیادت نے حکمرانوں کے ساتھ رابطہ قائم کر کے اسلام کی ایسی غیر انقلابی اور تنگ نظر تعبیر کر دی کہ وہ جاگیر دار سرداروں اور ملوک کے ہاتھ میں استحصالِ محنت کا آلہ بن گیا،،، اور آج تک یہی حالت بدستور قائم ہے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ مذاہبِ عالم کی مذہبی قیادت یا تو یہ بات قبول کرے کہ ہر مذہب کے بانی کی وفات یا قتل کے بعد چند سالوں میں انقلاب دشمن قوتوں نے مذہبی قیادت کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے مفاد کے لیے اس کی غیر انقلابی تعبیر و تشریح کر دی۔۔ اور اس بات کا اقرار کرے کہ مذاہب کی تعلیمات دراصل وہ نہیں ہیں جنہیں مقدس بانیانِ مذاہب، یعنی انبیاء نے تلقین کیا تھا۔ یہ تعلیمات اُس غیر انقلابی گروہ کے خیالات و نظریات ہیں جس نے ان تعلیمات کی من مانی تشریح کر کے انہیں مسخ کر دیا ہے۔ یا پھر اس بات کو قبول کر لے کہ ہر مذہب کی تاریخ جو گھناؤنا اور غیر انسانی منظر پیش کرتی ہے، وہی مذہب کی حقیقی تعلیمات ہیں۔

سماجی حرکیات کے سائنسی اصولوں کی تدوین و اشاعت کے بعد مذہبی عقائد کا زبان سے اقرار کر لینا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔۔۔ جب تک کہ ان عقائد کے نظریاتی، عمرانی، ثقافتی اور معاشی مضمرات و متضمنات کو واضح طور پر سامنے نہ لایا جائے، اور پھر انہیں زندہ معاشرتی حقیقت میں تحویل کرنے کے لیے ایک جاں گسل جدوجہد نہ کی جائے۔ اس ضمن میں تمام مذاہب میں سے اسلام پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، کیونکہ اس مذہب کی کتابِ مقدس کا متن (Text) بالکل محفوظ ہے، اور ہر دیانتدار دانشور اس میں حقیقی اسلام کی تصویر دیکھ سکتا ہے۔ اور کتابِ مقدس کے متن کے علاوہ بانیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے قریبی ساتھیوں کی تیئیس سالہ تابناک سعی و کاوش بھی اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ موجود ہے، جس کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو زندہ معاشرتی حقیقت میں تحویل کر دیا گیا تھا۔ ان دو ذرائع کے علاوہ پہلے دو خلفاء اسلام جن کی حیثیت اتمامِ کارِ نبوت کرنے والوں کی تھی، کے کارنامے بھی تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ کر رکھے ہیں۔ اس قیمتی مقدس اثاثے کے مطالعہ سے اسلام کی حقیقی تصویر اپنے پورے نقوش و رنگ کے ساتھ نہ صرف تحقیق سے کام لینے والے کے سامنے آجاتی ہے، بلکہ حضرت فاروقِ اعظم کی شہادت کے بعد کے واقعات اور ان کی وجہ سے اس تصویر کے نقوش میں جو بگاڑ پیدا ہوئے، عہدِ نبوی سے عہدِ فاروقی تک یہ تصویر ان دونوں عہدوں کے اسلام میں واضح فرق کو نمایاں کرنے کے لیے معیار کا کام بھی دیتی ہے۔

بہر حال اب یہ مذاہب عالم کا اپنا فرض ہے کہ وہ نیچرل سائنس اور سماجی حرکیات کی سائنس کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اپنا دفاع کریں۔ ورنہ تاریخی قوتیں تو ان کی موت کے پروانے پر دستخط ثبت کرنے کے لئے تیار کھڑی ہیں۔

ہر نئے انقلاب کا ماقبل کے واقعات وحوادث سے تعلق

البتہ مذاہب عالم میں سے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تاریخ بتاتی ہے کہ زوال وشکست کی حالت میں بھی جب مسلم سپین کے راستے ابن رشد اور دیگر مسلم دانشوروں کی عقلیت، اور ارتقاء یافتہ مسلم ثقافت جب یوروپ میں پہنچے تو وہاں نئے چراغ جلنے لگے۔ جدلیاتی سائنس کا یہ اساسی قانون ہے کہ کوئی شے یا کوئی معاشرتی ادارہ اور کوئی انقلاب یا تبدیلی اپنے وجود میں آزاد اور خود مکتفی نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنے سے ماقبل اشیاء، اداروں اور تبدیلیوں کے ارتقائی عمل سے وابستہ اور اپنی تخلیق میں ان پر منصر اہوتی ہے۔ کائنات کے اس دائمی اور سرمدی قانون کے مطابق یوروپ کی نشاۃ ثانیہ ،مذہبی اصلاح کی تحریک۔۔ ریفارمیشن۔۔، صنعتی انقلاب اور سائنسی عقلیت خود بخود مغرب کی سرزمین سے نہیں پھوٹ پڑے تھے اور نہ ہی آسمان سے گرے تھے۔ بلکہ یہ انقلاب مکہ کے منطقی نتائج تھے اگر انقلاب مکہ وجود میں نہ آتا تو یہ انقلابات بھی ظہور میں نہ آتے۔

لہٰذا سقوط اندلس اور بغداد کے بعد مسلم ذہنی قوتیں تو جمود کا شکار ہو گئیں، ان کی اجتہادی صلاحیتیں ختم ہو گئیں اور اس کے نتیجہ میں سیاسی زوال بھی گہرا ہوتا چلا گیا۔ انقلاب فرانس کے بعد کرہ ارض پر تمام مسلم ممالک یکے بعد دیگرے مغرب کی تازہ دم سیاسی اور سائنسی قوت کے قبضہ میں آتے چلے گئے۔ جس کی وجہ سے مسلم جاگیر داری معاشرہ میں اساسی تبدیلیاں عمل میں آنی شروع ہو گئیں۔ کائنات کے متعلق نئے سائنسی اکشامفات سے جاگیر داری عہد کے علم الکلام کا تارو پود بکھرنے لگا، اور مسلم دانشوروں نے محسوس کیا کہ مذہبی حقائق کے اثبات کے لئے اب نئے علم الکلام کی ضرورت ہے۔

چنانچہ مفتی محمد عبدہ، سعید حلیم پاشا، سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور ڈاکٹر علی شریعتی جیسے مسلم اسکالروں نے نئے علم الکلام کی تدوین شروع کر دی۔

نئی سائنسی عقلیت کا پہلا دور کائنات کے میکانکی تصور پر مشتمل تھا۔ میکانکیت میں حرکت دولابی ہوتی ہے۔ وہ ایک مرحلہ سے دوسرے ارتقاء یافتہ مرحلہ کی تشکیل پر منتج نہیں ہوتی اور اس میکانکی عقلیت کا انحصار زیادہ تر طبعیات کے مطالعہ پر تھا لہٰذا سر سید احمد خان، علامہ عنایت اللہ خان المشرقی اور جوہری طنطاوی جیسے مسلم دانشوروں کا علم الکلام کائنات اور معاشرے کے ارتقاء پذیر عمل کی توضیح کرنے سے قاصر تھا۔ قرآن حکیم کے بعض واقعات جیسے پیدائش مسیح، اصحاب کہف کی نیند، عصائے موسیٰ کی ضرب کلیمی کے نتائج، نزول وحی کی نوعیت وغیرہ کی میکانیکی توجیہ کرنے میں بھی یہ عقلیت ناکام رہی۔

سماجی حرکیات کی سائنس

لیکن بعد میں نامیاتی کیمیا کے اعمال کا مطالعہ، ایٹم کے انشقاق، مادہ کا انرجی میں تحویل ہو جانا اور انرجی کے کوانٹم تصور وغیرہ سے کائنات کی میکانیکی توجیہ میں جوہری تبدیلیاں عمل میں آگیں اور ان تبدیلیوں کی اساس پر کارل مارکس کی معاشرتی حرکیات کی سائنس کی تدوین وجود میں آگئی۔ جس

میں حرکت کے کیریکٹر کو جدلیاتی تسلیم کر لیا گیا۔ یہ جدلیاتی حرکت وجود کے سادہ سے پیچیدہ اور ادنی سے اعلی مراحل کی طرف حرکت کرتی ہے۔ یعنی یہ تخلیق میں تو جدلیاتی عمل سے وابستہ ہے مگر اپنی فطرت میں ترقی پسند یعنی۔۔ سپائرل۔۔ہے۔

سماجی حرکیات کی سائنس میں یہ اصول اساسی حیثیت رکھتا ہے کہ شعور اور وجود میں ایک نامیاتی تعلق ہے جو نا قابل شکست ہے، اور ان دونوں میں باہمی تفاعل بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں یہ اصول واضح طور پر سامنے آگیا کہ تمام معاشرتی مظاہر معاشی اساس کی نوعیت کے مطابق اپنی تعبیر کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کے لئے سب سے پہلے معاشی اساس کی استحصال پسند یا غیر استحصالی نوعیت کو سمنا پڑتا ہے۔ اس تفہیم کے بغیر ہر معاشرتی مظہر کی توجیہ و توضیح بنیادی طور پر غلط ہو جاتی ہے اور انسانی ذہن معروضی معاشرتی حقیقت تک پہنچنے کی بجائے معاشرتی التباسات میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

اس نئی صورت حال سے آگہی حاصل کرنے کے بعد جو علم الکلام مرتب ہوا اس کے بانی امام عبید اللہ سندھی، اور علامہ اقبال اور ڈاکٹر علی شریعتی ہیں۔ قرآن کی اساس پر عہد حاضر کے کائناتی اور عمرانی مسائل کو حل کرنے کے لئے اس نئے علم الکلام کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ بد قسمتی سے سنی اور شیعہ مسلمانوں میں رجعت پسند دینی ذہن کے عمل دخل اور استحصال پسند طبقات کے اقتدار کی وجہ سے ابھی تک یہ علم الکلام ایک موثر اور فیصلہ کن نظریاتی قوت کی حیثیت حاصل نہیں کر سکا۔ اگرچہ ان دونوں بزرگوں کا یوم پیدائش پاکستان اور ایران میں سرکاری سطح پر منایا جاتا ہے مگر کسی دانشور نے ابھی تک قرآن حکیم کی مکمل تعبیر اس نئے علم الکلام کی روشنی میں مرتب نہیں کی ہے۔ البتہ اگر کسی نے اس پر کچھ کام کیا بھی ہے تو اسے ہماری ثقہ مذہبی پیشوائیت نے درخور اعتنا نہیں سمجا۔ کیونکہ اس کے اپنانے سے وہ دنیا ہی بدل جاتی ہے جس میں اس کا سکہ رواں ہے۔

تبویب و تصریف کے اصول

اس سلسلے میں فہم قرآن کے لیے جو اصول آج کل رائج ہے، اور جسے تمام اصولوں کے مقابل احسن کہا جاتا ہے وہ ہے تبویب۔ غائر مطالعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس اصول نے پہلے کے تمام اصولوں کے مقابل تفسیر بالرائے کا دروازہ زیادہ بہتر طور پر کھول دیا ہے۔ خرابی یہ ہے کہ اس اصول کو استعمال کرنے سے پہلے کسی مسئلے یا مسلک کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق ایک رائے قائم کر لی جاتی ہے۔ پھر اس رائے کی تائید میں قرآن کی تمام سورتوں میں سے حسب مطلب آیات منتخب کر کے ان کی ایک ترتیب دے لی جاتی ہے اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس ترتیب آیات سے جو دلائل مہیا ہوئے ہیں وہ قرآن حکیم کے اپنے دلائل ہیں، جن میں صاحب مضمون کی اپنی رائے کا دخل نہیں ہے۔ چنانچہ ہر اسلامی مسلک اور فرقہ کا دانشور اپنے حق میں اس پہلے سے سوچے سمجھے عقائد کے مطابق قرآنی آیات سے استدلال حاصل کر لیتا ہے۔

تفہیم قرآن کے اس اصول کے لئے کسی دقیق اور عمیق مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے لئے نہ تو نزول قرآن کے عہد کے تاریخی پس منظر کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے نہ ہی ترتیب نزولی اور مکی دور کی جدوجہد کی غایات کو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ حالانکہ دور جدید کے

ترقی پسند سکالرز عمومی طور پر ان نکات کو اہم جانتے ہیں اور ان کو زیر تحقیق لانے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اسطرح کسی دیدہ ریزی اور عمیق مطالعہ کے مشکل مرحلے سے گذرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ بہت آسانی سے ہر شخص اپنے مزعومہ عقائد کی تائید میں قرآنی آیات کا انتخاب کر لیتا ہے۔

معاملے کے دوسرے لیکن اہم ترین موضوع سے متعلق یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ قرآن حکیم کی آیات کو مختلف موضوعات کے لحاظ سے مرتب کرنا بھی تبویب کہلاتا ہے اور اسے تصریف آیات کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ مگر اس انداز کی تبویب یا تصریف میں اور مذکورہ بالا تبویب میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ تبویب کی اِس دوسری قسم میں ایک موضوع کے متعلق قرآن حکیم کی تمام آیات کو اکٹھا کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس موضوع کے تمام پہلوؤں کے متعلق قرآنی روشنی مہیا ہو جائے۔ مگر پہلی قسم کی تبویب میں صاحب تبویب کے اپنے متعین کردہ مقاصد وعقائد کے لئے دلائل فراہم کئے جاتے ہیں۔ اور یہ صریحاً تفسیر بالرائے ہے، جس کے ذریعے قرآن سے روشنی حاصل کرنے کی بجائے اپنے ہی عقائد کو قرآن پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ اس اصولِ تفہیم کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ:- " خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں،،،،،، ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق"۔

ترتیب نزولی کی معرفت اور اسے پیش نظر رکھنے کا قضیہ ؟

قرآنی دانشوران کے ایک فاضل حلقے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترتیب نزولی کو نظر انداز کرنے سے ایک موضوع کے متعلق تبویب و تصریف آیات بھی اس مطلوبہ موضوع کے متعلق قرآنی منشاء کو پوری طرح ظاہر کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ دی جاتی ہے کہ سورہ آل عمران میں محکمات ومشابہات کے متعلق آیات میں مشابہات کے مفہوم کی تصریح کرنے میں جس قدر الجھاو پیدا ہوئے ہیں اگر ترتیب نزولی کے مطابق سورہ ہود کی پہلی آیت کو مطالعہ کر لیا جاتا تو متشابہہ کا مفہوم متعین ہو جاتا اور متشابہات فصلات قرار پاتیں۔ لیکن ترتیب نزولی کی رعایت کے بغیر مدنی آیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی اس لئے متشابہات کو قرآنی حکمت کی تشریح وتفصیل سمجھنے کی بجائے مشتبہ المراد قرار دے دیا گیا۔ اور وہ اساسی عقائد جن میں قرآن حکیم کی مابعد الطبیعاتی تعلیم کو بیان کیا گیا ہے اور جن کے متعلق مکی قرآن دلائل سے بھرا پڑا ہے، بلکہ زندگی کی تعمیر نو کے لئے مکی دور کی ساری جدوجہد انہی مابعد الطبیعاتی نظریات کی اساسی حیثیت کو منوانے اور پھر ان کے مضمرات و متضمنات کو زندہ معاشرتی حقیقت میں بدلنے کے لئے کی گئی۔ تاکہ انسان کائنات، تاریخ، معاشرہ کی طبقاتی حیثیت اور اس کے منطقی نتائج اور اپنی فطرت کے نوامیس عالیہ اور تخلیقی غایت کو نظر انداز کر کے معاشرتی زندگی کی نئی تعمیر غلط بنیادوں پر استوار نہ کرنے پائے، جیسا کہ قرآن سے پہلے اور بعد کے تمدنوں میں ہوتا رہا ہے۔

اسی ضمن میں دوسری مثال لفظ مثانی کی دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا معنی بھی مکی قرآن کے لازمانی ولامکانی کیریکٹر کو نظر انداز کر کے تثنیہ قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ اس آیت عظیم میں تمام صحف اولیٰ کی تعلیمات کا وارث نبی اکرم [ص] کو قرار دیا گیا ہے۔ یعنی قرآن حکیم کی اساسی حکیمانہ

تعلیمات وہی ہیں جنہیں پہلے انبیاء کے صحائف میں بار بار دہرایا گیا ہے۔لہذا موجودہ ترتیب مصحف کو سامنے رکھ کر قرآنی سورتوں کو جوڑا جوڑا قرار دے دیا گیا جس میں کسی انٹرنیشنلزم، کسی سائنسی اور ابدی حکمت کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ جب کہ مثانی کا ترجمہ بار بار دہرائی جانے والی آیات کرنا اپنے اندر سائنسی اور ابدی و سرمدی تعلیمات رکھنے والی حقیقت ہے۔لہذا اس نظم قرآن سے قرآن محض مسلمانوں کے لئے وقتی کتاب بن کر رہ جاتا ہے۔لہذا معلوم ہوا کہ اگر ترتیب قرآن کو نظر انداز کر دیا جائے تو مختلف موضوعات کے لئے منتخب آیات بھی قرآنی مفہوم کو واضح نہیں کر سکتیں۔

تاہم اس کے برعکس دوسرا جدید ترین اور ترقی یافتہ نقطہِ نظر یہ ہے کہ ترتیب نزولی کو تاریخی تناظر کی فہم کے علاوہ کسی دیگر تناظر میں لینا اور اساسی اہمیت کا حامل مان لینا قرآن کی آفاقیت اور ہمہ گیریت کو محدود کر دینے کے مترادف ہو گا۔ قرآن کسی مخصوص ٹائم زون میں کسی مخصوص ترجیحی ترتیب کا محتاج نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا پیغام عہد آفریں ہے، اور ابد الآباد تک کے لیے جاری و ساری ہے۔ اس کے فہم میں سوائے اس کے کہ زیر نظر موضوع کو ہمیشہ اس کے سیاق و سباق ہی میں دیکھا جائے، کسی دیگر ترتیب و تناظر کی محتاجی اسے ایک اضافی حیثیت میں گرا دینے کی متقاضی ہو گی۔ نیز یہ کیسے فرض کر لیا جائے کہ اللہ اور رسول نے اس کی ترتیب اسی طرح مرتب نہ کی ہو گی جیسا کہ منشائے قدرت تھا۔ صاحب کتاب خود اپنی ذات عالی پر اس کی تجمیع و تفہیم و ترتیب کی ذمہ داری عائد فرماتا ہے۔لہذا ترتیب نزولی میں تشکیک کا عنصر پیدا کرنا یا اس ترتیب کی واجبی سے زیادہ اہمیت و فوقیت کا قضیہ اُٹھانا بے سُود ہو گا اور ایک قدیمی فتنہ از سرِ نو کھڑا کر دینے کا موجب بھی۔فلہٰذا اس نکتے پر ہم اپنے نہایت گرامی قدر دانشوران کی رائے سے اختلاف کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

اسی نقطہِ نظر کے مطابق تبویب اور تصریف آیات کا درجِ بالا ثانوی مذکورہ طریقہ جس میں موضوعات کی مناسبت سے تمام متعلقہ آیات کو اکٹھا کر لیا جاتا ہے اور پھر ان کے ترجمے سے قرآن کی روشنی کو مکمل طور پر اپنی زبان میں واضح اور بیان کر لیا جاتا ہے، ہر لحاظ سے ایک جامع اور کسی بھی خطا اور کمزوری سے مبرّا طریقہ ہے جس میں محکمات و متشابہات سے متعلقہ آیات کو اکٹھا کرتے وقت سورہ ہود کی پہلی آیت کو بھی غیر مشروط طور پر زیر نظر لایا جائیگا۔ اور تمام مابعد الطبیعاتی بیانات کو بھی ادب عالی کے استعاراتی اسلوب میں شناخت کرتے ہوئے معروضی سائنسی، نفسیاتی، شعوری، عمرانی اور ارتقائی تناظر میں زیر تحقیق لا کر سیاق و سباق کے مطابق قابل فہم ترجمے کے دقیق مرحلے سے گذارا جائیگا۔ تشریح و تفہیم ایک بیرونی مداخلت سمجھی جائیگی، کیونکہ قرآن کی عبارات اپنی نصوص صریحہ کے مطابق خود تشریحی، خود مکتفی، تفصیل و تفسیر شدہ ہیں۔ کوئی بھی تفسیر و تفہیم ذاتی فہم و تصورات کی بھاری ملاوٹ کے بغیر تحریر نہیں کی جا سکی اور قرآنی نصوص کو انسانی سوچ سے آلودہ کرنے کے گناہ کے علاوہ اور کسی بھی مثبت اقدام کی عکاسی نہیں کر سکی۔

تفسیر نویسی کا قضیہ اور اس کی ناکامی

تاریخ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ قرآن مجید کی جو تفسیریں لکھی گئیں ان کی بہت بڑی تعداد خود قرآن اور اس کے قاریوں کے درمیان ایک حجاب بن گئی۔ یوں تو اس افسوسناک صورت حال کا سبب ہمارے تمام تر روشن خیال علمائے متقدمین ومتاخرین نیز ہمعصر سکالرز یہ بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں مسلمانوں کے ہاں علوم وفنون کی تدوین ہوئی اور اس کے نتیجے میں قرآن مجید کی تفسیریں بھی لکھی گئیں، وہ زمانہ ایرانی اور یونانی فکر سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ ان اجنبی افکار نے اسلام کے سیدھے سادے عقائد کو ایک امتحان میں ڈال دیا تھا۔ ان کی مدافعت کے لئے علمائے دینیات بالخصوص متکلمین نے جو راہ اختیار کی اس نے اس مسئلے کو اور پیچیدہ بنا دیا۔ انہوں نے قرآن کی تشریح ان فنی اصطلاحات کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی جو اس دوران وضع ہو چکی تھیں۔ اسی طرح مفسرین نے جو تفسیریں لکھیں تو انہوں نے غیر شعوری طور پر اپنے خیالات کی تائید کے لئے قرآن ہی کے صفحات سے اپنی سند ڈھونڈنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن ہی کی سند سے اپنے مخالفین کے خیالات کی تردید کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام اشعری نے قرآن کی تفسیر لکھی تھی، جس میں انہوں نے ہر اس آیت کی، جسے ان کے مخالفین نے اپنے حق میں پیش کیا تھا، اس طرح تشریح کی کہ اس سے ان کے خیالات کی تائید ہوتی تھی۔ قرآن کی تشریح وتفسیر کا یہ طریقہ متکلمین اور اصحاب عقل ورائے ہر دو نے اختیار کیا۔

دوسرا جدید ترین مکتب فکر ہے جو جدلیاتی عقلیت کی متابعت میں اسلامی تاریخی ادوار اور ان کے واقعات کی جانچ کا پیمانہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے مذکورہ بالا زمانے سے بھی ماقبل کے زمانے میں تفسیر نامی انحراف کی جڑ بنیاد کی تحقیق کرتا ہے۔ وہ اس اساسی فلسفے پر غور وخوض کرتا ہے کہ آخر عربی زبان بولنے اور سمجھنے والوں کو قرآن اپنی ہی مادری زبان کے ذریعے براہ راست سمجھنے کی بجائے تفسیر کے ذریعے سمجھنے پر آمادہ کرنے کی وہ کیسی پابندی تھی جس کے جبری طاقتور دھارے نے وقت کے تمام سکالرز کو ساتھ بہالے جانے کا سامان کیا۔ اور سب ہی قرآن کی خالص اور مصفا عبارت کی بجائے انسانی تفاسیر کی قصہ گوئیوں میں مشغول ومنہمک ہو گئے۔ یہ مکتب فکر اس بڑے اساسی انحراف کے اسباب ملوکیت کے ناجائز تسلط میں اور اس تسلط کے مقتضیات میں تلاش کرتا ہے۔ یہ تحویلِ اقتدار اپنی فطرت میں غیر اسلامی روح کا حامل تھا اس لیے حقیقی اسلامی روح کا ابطال اس کا اولین فرض منصبی تھا۔ اسلام کی اساس قرآن حکیم تھا، اس لیے خود کو اس اساسی راستے سے انحراف کے الزام سے بچانے کا یہی طریقہ دستیاب تھا کہ قرآن کے پیغام کی روح کو ہی مسخ کرتے ہوئے اسے ملوکیتی مفادات کا ہم آہنگ کر دیا جائے۔ عمر فاروق کے دور میں قرآن کے لاکھوں نسخے تیار کروا کر سلطنت کے طول وعرض میں پھیلا دیے گئے تھے، شاید اسی لیے قرآنی نصوص کو تو مسخ کرنا ایک ناممکن الحصول حربہ پایا گیا۔ متبادل حل یہی نکالا گیا کہ قرآن کے ذیل میں ہی یہودیت کی تالمود کے انداز میں تفسیر نویسی [interpretation; exegesis] کا ایک نیا فن ایجاد واختراع کیا جائے جس کے توسط سے قرآن کے معانی کو تورات سے اخذ شدہ دیومالائی افسانوں کے پیچ وخم میں الجھا دیا جائے۔

یہودی علماء ایک معتدبہ تعداد میں میسر تھے اور ان کی اسلام دشمنی کے باعث اس مہم کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لینا شاہی دربار کے لیے نہایت سہل تھا۔ مشہور تاریخ دان مصنفہ کیرن آرمسٹرونگ کی جدید ترین ریسرچ کے مطابق حضور رسالتمآب کو یثرب میں حاکمیت حاصل کر لینے پر کم از کم بیس یہودی قبائل کی مسلح مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جب کہ مسلمانوں کی تاریخ میں اس امر واقعہ کی سنگینی کو جان بوجھ کر گھٹانے کی کوششیں کی گئی

اور صرف تین یہودی قبائل کا ذکر کیا گیا۔ یہ تاریخی حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ مغربی اور وسطی عرب میں اسلام سے ماقبل کی یہودی سلطنتوں کی میراث کے باعث ایک غالب یہودی عنصر کی موجودگی ثابت تھی۔ تیسرے مرحلے میں بیرونی تاریخ کی تحقیق نے اس حقیقت کا انکشاف بھی کیا کہ آنحضرت کی پیدائش سے صرف آٹھ سال قبل ساسانی سلطنت میں ہرمز چہارم کے برسر اقتدار آتے ہی عراق سے آٹھ لاکھ تعلیم یافتہ اور آسودہ حال یہودیوں نے یکبارگی ہجرت اختیار کی اور جزیرہ نمائے عرب کے چپے چپے پر آباد ہو گئے۔ تجارتی مراکز، باغات اور دینی مدراس قائم کیے۔ اسلامی تحریکِ انقلاب کے مقابلے میں شکست سے دوچار ہو جانے کے بعد یہ یہودی آبادی زیرِ زمین سرگرمیوں میں مصروف ہو گئی اور بیشتر نے اسلامی علماء، فقہاء، مفسرین، محدثین و مصنفین کا روپ اختیار کر لیا۔ اسلام دشمن ملوکیت نے اقتدار غصب کر لینے کے بعد نہ صرف ان کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا بلکہ بنوامیہ کے مذموم عزائم کے باعث پہلی, دوسری اور اوائل تیسری صدی کے بیشتر اسلامی لٹریچر کا مصنف و مرتب یہی یہودی تعلیم یافتہ طبقہ تھا۔ ایرانی تہذیبی اثرات جن کا شور و غوغا ہم تسلسل سے سنتے آئے ہیں، ایک خام خیالی تھی . یہ اثرات مابعد کے زمانے میں عباسی اقتدار کے کمزور ہو جانے کے بعد تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں غالب آئے جب اسلامی ڈسپلن کا تاریخی انحراف اپنی جڑوں سے مضبوط ہو کر تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

ملوکیت کے جبر کے تحت یہ کارواں اپنے متعین راستے سے بھٹک گیا۔ پھر تو متکلمین کا زورِ بیان تھا اور مفسرین کے تخیل کی بلند پروازی جو باقی رہ گئی۔ اکثریت ایسے علماء پر مشتمل تھی جنھوں نے نئے افکار و خیالات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک تفسیر کا وہ ورثہ جو روایات کے ذریعے علمائے متقدمین کی طرف سے ان تک پہنچا ہے، قرآن کی تشریح و تفسیر کے لئے صرف وہی ایک واسطہ بن سکتا ہے۔ لیکن اس میں دقت یہ تھی کہ متقدمین کا روایتی علم تفسیر اُن قصوں سے بہت زیادہ متاثر تھا جو اصلا یہودی تھے اور وہ متقدمین کی تفسیر کا ایک حصہ بنا دیے گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن میں پہلے انبیاء کے بعض قصے مذکور ہیں اور ان سے غرض انسانوں کے لئے نصیحت و عبرت ہے۔ لیکن چونکہ انسانی فطرت نامعلوم کو معلوم کرنے کے لئے بے تاب رہتی ہے اس لئے قرآن کا مطالعہ کرنے والوں نے پہلے انبیاء کے ان قصوں کی تفصیلات جاننے کے لئے یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف ہی رجوع کیا۔ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ابن خلدون لکھتے ہیں: " علمائے متقدمین کی اس موضوع پر پوری تالیفات تھیں، تاہم ان کی ان تالیفات اور روایات میں جو ان سے مروی ہیں، اہم اور غیر اہم، قابل قبول اور ناقابل قبول باتیں پہلو بہ پہلو موجود تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں عربوں کے ہاں نہ تو کتابیں تھیں اور نہ ہی علوم و فنون۔ بدویت اور امیت ان پر غالب تھی۔ جب انہوں نے بعض باتیں معلوم کرنی چاہیں، جنہیں انسان معلوم کرنے کے لئے عام طور سے بے تاب ہوتے ہیں، جیسے موجودہ چیزیں کیوں وجود میں آئیں؟ تخلیق کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اور یہ کائنات اور اس کے اسرار کیا ہیں؟ تو اس کے لئے انہوں نے اہل کتاب ہی کی طرف رجوع کیا اور ان امور کے بارے میں انہی سے معلومات حاصل کیں۔ یہ اہل کتاب یہودی تھے، جن کے پاس تورات تھی اور نصرانی تھے جو یہودیوں کی طرح تورات کو بھی مانتے تھے۔ "

اگرچہ ابنِ خلدون نے بھی بیشتر دانشوروں کی مانند اپنے تجزیے میں بوجوہ ملوکیتی جبر کے ذکر سے پرہیز کیا ہے اور ثانوی مقتضیات ہی کو زیرِ بحث لاتے رہے ہیں، بہر حال ہوا یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ قرآن کی روح تفسیروں اور تشریحوں کے مصنوعی پردوں کے پیچھے زیادہ سے زیادہ مخفی ہوتی چلی گئی۔ ہر نئے مفسر کے لئے یہ معمول ہو گیا کہ وہ اپنے زمانے میں مروجہ مذہبی اور فلسفیانہ افکار کا سراغ قرآن میں لگائے، اگرچہ قرآن کے اپنے مطالب اور اس کا اسلوب اس طرح کی فلسفیانہ تعبیرات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔اسی مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:-

" صدر اول کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ روم وایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر یونانی علوم کے تراجم نے علوم وفنون وضعیہ کا دور شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا، قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں ناآشنا ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ قرآن کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی۔ چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی اس لئے طرح طرح کے الجھاو پیدا ہونے لگے۔ اور پھر جس قدر کوششیں سلجھانے کی کی گئیں، الجھاو اور زیادہ بڑھتے گئے۔" ۔۔۔۔۔۔ یہاں بھی ہم یہی نوٹ کرتے ہیں کہ مولانا آزاد کے پائے کا بحر العلوم دانشور بھی یونانی علوم کے تراجم اور رومی وایرانی تمدن ہی کو اس تاریخی انحراف کا ذمہ دار قرار دیتا ہے، اس امر کو روشنی میں لائے بغیر کہ فتنہِ وضعیت کے اس طوفان کے پیشِ نظر حکومتِ وقت اپنے فرائض کی ادائیگی میں کیوں غفلت برتنے پر مصر رہی اور اپنے ہی دینی ضابطے کے بڑے بگاڑ کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود روکنے میں کیسے ناکام رہی۔

جدید ترین منہاج

یہی وہ زمانہ ہے جس میں قرآن کی تفسیر کے متعلق دو غیر صحت مندانہ اور ایک دوسرے کے مدمقابل طریقے بروئے کار آئے۔ ان میں سے ایک متکلمین کا اور دوسرا اصحاب الروایت کا طریقہ تھا۔ یہ اصحاب الروایت یہودیت کے مثناۃ [Mishnah] یعنی زبانی روایت [oral tradition] کی تقلید میں حدیثِ رسول کے نام پر گھڑی گئی زبانی روایات پر مبنی قرآنی آیات کے شانِ نزول کی داستانوں کی مطابقت میں تفسیر نویسی کے قائل تھے۔

قرآن کی حقیقی روح تک پہنچنے کے لئے قرآن کے طلبہ کو اس کے چہرے سے اس اسلامی تالمود [فنِ تفسیر] اور اسلامی مثناۃ [علمِ روایت] کے سب پردوں کو ہٹانا ہے اور انہیں ان سیاسی، معاشرتی اور مذہبی انحرافات کا مطالعہ کرنا ہے جو اسلامی تاریخ کے صدر اول کے دور میں ہی وقوع پذیر ہوئے۔ انہیں خلافت راشدہ کے ملوکیت سے تبدیل ہونے کے مقتضیات و متضمنات پر تحقیق کرنا چاہیئے۔ عہد قدیم میں بھی اور آج بھی ایسے علماء ہیں جو اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ قرآن کے طلبہ کو اس کا پیغام خود اس کے صفحات میں معلوم کرنا چاہیئے۔ علامہ سیوطی کا قول ہے کہ علما کے نزدیک جو شخص قرآن کا صحیح مفہوم معلوم کرنا چاہتا ہے اسے سب سے پہلے اس کی تلاش خود قرآن ہی کے صفحات میں کرنی چاہیئے، کیونکہ اگر قرآن ایک جگہ کسی چیز کا اجمالی طور پر ذکر کرتا ہے تو دوسری جگہ اس کی مزید تفصیل کر دیتا ہے۔ ابن جوزی نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ خود ہمارے دور میں بھی بہت سے علماء نے اس بات پر زور دیا ہے۔ سب سے بڑھ کر ہمیں تفسیر نویسی کی حدود فراموشی سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے اپنی

زبان میں قرآن کا ایک باضابطہ خالص ترجمہ کرنا ہے جس میں ہمارے خیالات و تصورات پر مبنی ایک لفظ کا بھی اضافہ نہ کیا گیا ہو۔ یہ خالص ترجمہ تمام مذکورہ اصول و قواعد کے ساتھ ساتھ قرآن کے اُس مقصود و مطلوب کو شدت سے پیش نظر رکھتا ہو جو مساواتِ انسانی کی بنیاد پر ایک لا طبقاتی معاشرہ قائم کرنے کی اساسی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ آنے والے ادوار کے لیے فہم قرآن کا یہی جدید ترین منہاج ہو گا جس کے طفیل انسان کے ہموار اور بالسرعت شعوری ارتقاء کے لیے راہیں ہموار ہو جائیں گی۔